متمتع ہونے کا ایک صلہ اور معاوضہ ہے جسے شریعت نے ضروری قرار دیا ہے۔ لہذا اسے بیوی کو شوہر کے گلے باندھنے کے لئے بطور ایک ہتھیار استعمال کرنا مہر کی حقیقت سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

خَيْرُ الصَّدَاقِ أَيْسَرُهُ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین مہر وہ ہے جو آسان ہو۔ [۱۰۹]

مِنْ يُمْنِ الْمَرْأَةِ أَنْ يَتَيَسَّرَ فِي خِطْبَتِهَا، وَأَنْ يَتَيَسَّرَ فِي صَدَاقِهَا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کی سعادت کی بات یہ ہے کہ اُسے نکاح کا پیغام دینا آسان ہو اور اس کا مہر آسان ہو۔ [۱۱۰]

أَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ صَدَاقًا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برکت کے اعتبار سے عظیم ترین عورتیں وہ ہیں جو مہر کے اعتبار سے آسان ہوں۔ [۱۱۱]

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مہر میں مبالغہ کرنے سے بسا اوقات شوہر کو بیوی سے ایک طرح کی عداوت و نفرت پیدا ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث کے مطابق اس بارے میں حضرت عمرؓ نے فرمایا:

إِنَّ الرَّجُلَ لَيُغَالِي بِصَدُقَةِ امْرَأَتِهِ حَتَّى يَكُونَ لَهَا عَدَاوَةٌ فِي نَفْسِهِ وَحَتَّى يَقُولَ كُلِّفْتُ لَكُمْ عِرْقَ الْقِرْبَةِ:

کوئی شخص اپنی عورت کا بہت زیادہ مہر باندھ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ (اسے ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے) اسے اپنی بیوی سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس سے کہنے لگتا ہے کہ میں تمہاری وجہ سے مشقت میں پڑ گیا۔ [۱۱۲]

---

۱۰۹ سنن کبریٰ ۷/۲۳۲، مستدرک حاکم ۲/۱۸۲، ابوداؤد ۲/۵۹۱، بلوغ المرام۔

۱۱۰ صحیح ابن حبان ۷/۱۵۸، سنن کبریٰ ۷/۲۳۵، حاکم و نسائی منقول از کنز ۱۶/۴۸۴، ورواہ الطبرانی فی الصغیر والاوسط: مجمع الزوائد ۴/۲۸۱۔

۱۱۱ مستدرک حاکم: ۲/۱۷۸، السنن کبریٰ: ۷/۲۳۵۔

۱۱۲ نسائی ۶/۱۱۸، ابن ماجہ ۱/۶۰۷، مستدرک ۲/۱۷۵، سنن سعید بن منصور ۱/۱۵۲، دارمی ۲/۱۴۱، سنن کبریٰ ۷/۲۳۴، مصنف عبدالرزاق ۶/۱۷۵۔

مہر میں مبالغہ نہ کرنے کی تاکید!

دورِ رسالت میں لوگ غالباً اپنے مہر کا مطالبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے جیسا کہ بعض حدیثوں سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق ایک صحابی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ میں نے نکاح کر لیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے ہیں کہ کتنے مہر پر؟ وہ کہتے ہیں کہ چار اُوقیہ (ایک سو ساٹھ درہم) پر اس پر آپ فرماتے ہیں۔

علی ربعة اواق! کانما تنحتون الفضة من عرض هذا الجبل. ما عندنا ما نعطیك: چار اوقیے! گویا کہ تم چاندی اس پہاڑ سے چھیل کر لاتے ہو۔ ہمارے پاس اتنا نہیں ہے جو تمہیں دے سکیں۔[۱۱۳]

امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب شوہر کی مالی حالت کو دیکھتے ہوئے زیادہ مہر باندھنے کی کراہت ہے۔[۱۱۴]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی ملکیت میں فی الحال جو چیز موجود ہو اسی کے مطابق مہر باندھنا چاہیئے۔ اور غیر مملوکہ چیزوں پر نکاح کرنا ناپسندیدہ ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک دوسرے صحابی (ابو حدرد اسلمیؓ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر مہر کے بارے میں استعانت طلب کرتے ہیں اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دریافت کرتے ہیں کہ تم نے کتنا مہر باندھا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ دو سو درہم۔ اس پر آپ فرماتے ہیں:

لو کنتم تغرفون من بطحان ما زدتم: اگر تم وادی بطحان (مدینے کی ایک وادی) کو کاٹ رہے ہوتے تو اتنا مہر نہ باندھتے۔[۱۱۵] یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طنز کے طور پر فرمائی۔ مطلب یہ کہ اپنی وسعت و طاقت سے زیادہ مہر باندھنا ناپسندیدہ ہے۔ (باقی آئندہ)

---

۱۱۳ صحیح مسلم کتاب النکاح: ۲/۱۰۴۰، سنن کبریٰ ۷/۲۳۵، ورواہ البزار: مجمع الزوائد ۴/۲۸۱۔

۱۱۴ شرح صحیح مسلم: ۹/۲۱۱   ۱۱۵ مستدرک ۲/۱۷۸، السنن کبریٰ ۷/۲۳۵، ورواہ احمد والطبرانی فی الکبیر والاوسط ورجال احمد رجال الصحیح: مجمع الزوائد ۴/۲۸۲۔

مولانا فیض الحسن سہارن پوری۔ ایک مطالعہ

عبدالحق حقانی القاسمی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

باوجِ پایۂ اشعارِ من خود ندیدم در جہاں کس را
وزیں پس مثل او ہرگز نہ بیند چشمِ افترا ہم
علامہ شبلی نعمانی

مولانا فیض الحسن سہارن پوری عربی کے ممتاز ادیب ہیں۔ انھوں نے طلباء میں عربی ادب کا صحیح ذوق و شعور پیدا کیا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن کے متعدد پہلوؤں پر مولوی سعید اقبال قریشی نے لاہور یونیورسٹی سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔

۱۔ سوانحی کوائف :

مولانا فیض الحسن نے سہارن پور کے ایک زمین دار گھرانے میں ۱۸۱۶ء میں اپنی آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد ماجد خلیفہ علی بخش زبردست عالم فاضل تھے۔ ان سے ہی ابتدا سے مختصرات تک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر رامپور کا علمی سفر کیا جہاں معقولات کے امام علامہ فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ) سے اکتساب فیض کیا۔ اسی دوران ۲۰ سال کی عمر میں شادی ہوگئی مگر حصول علم کا شوق دل میں موجزن تھا اس لئے دلی کی راہ لی اور مشہور زمانہ عالم مفتی صدرالدین آزردہ (م ۱۸۶۸ء) کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ یہیں شاہ احمد سعید مجددی (م ۱۲۷۷ھ) اور آنون صاحب ولایتی سے بھی استفادہ کیا اور حدیث کے کچھ اسباق پڑھے۔ ادب سے دلچسپی کی وجہ سے حکیم مومن خاں مومن (م ۱۸۵۲ء) اسداللہ خاں غالب (م ۱۸۶۹ء) اور ابراہیم ذوق (م ۱۸۵۴ء) کی محفلوں میں بھی شرکت کرتے رہے اور شعر و سخن کے سلسلے میں امام بخش صہبائی (م ۱۸۵۷ء) سے مشورۂ سخن لینے لگے۔

[redacted]

دلی ہی میں حکیم امام الدین خاں سے طب کا علم بھی حاصل کیا۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں تک دلی ہی میں تدریسی خدمات انجام دیں مگر ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی سہارن پور آ گئے اور طب کو ہی ذریعہ معاش بنایا۔ ۱۸۶۲ء میں مولوی سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) نے سائنٹفک سوسائٹی میں ترجمہ کی خدمت کے لیے غازی پور آنے کی دعوت دی۔ مولانا نے وہاں یہ کام بخوبی انجام دیا اور پھر سر سید احمد خاں کے علی گڑھ تبادلے کی وجہ سے ان کے ساتھ مولانا بھی علی گڑھ آ گئے اور عربی کتابوں کے ترجمے کرتے رہے۔

۱۸۷۰ء کے اوائل میں ڈاکٹر لائٹنر (۱۸۳۲ء۔۱۸۹۹ء) کے ایما پر اورینٹل کالج لاہور آ گئے جہاں عربی کے صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ ان کی ادبی اور علمی شہرت کی وجہ سے ملک کے کونے کونے سے استفادہ کی خاطر طلبا آنے لگے۔ درس و تدریس کے علاوہ یہاں تصنیفی سرگرمیاں بھی رہیں اس کے ساتھ کالج سے شائع ہونے والے ایک تحقیقی مجلہ "شفاء الصدور" کی ترتیب و ادارت کا فرض بھی انجام دینے لگے اس زمانے میں کالج میں مشہور ادیب اور انشا پرداز "آب حیات" کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد بھی تھے جن سے نظریاتی اختلافات کی وجہ سے ہمیشہ چپقلش جاری رہتی تھی۔ مولانا ۱۷ برس تک اس کالج سے وابستہ رہے آخر ۶ فروری ۱۸۸۷ء میں انتقال فرما گئے۔ ان کی وفات کے بعد مولوی رشید احمد جو کہ مولانا کے صاحبزادے تھے عربی اور فارسی کی تعلیم دینے لگے۔ لہ

۲- مولانا کی کائنات شعر و ادب:

مولانا مختلف زبانوں کے شعر و ادب سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں انہوں نے شعر کہے ہیں اور اس میدان میں اپنی ایک نمایاں اور مستحکم حیثیت بھی بنائی ہے اردو میں ان کا تخلص خیال تھا۔ امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ اس زبان میں بہت سے شعر کہے ہیں۔ ان کا اردو شعری مجموعہ "گلزار فیض" کے نام سے مولوی رشید احمد نے شائع کر دیا ہے۔ لالہ سری رام نے اپنے مشہور تذکرے "خمخانۂ جاوید" میں ان کی ادبی عظمت کے اعتراف کے ساتھ اردو کے کچھ شعر درج کیے ہیں:

"فیض الحسن خیال سہارنپور کے باشندے، بڑے جید استاد اور فاضل دہر مانے جاتے ہیں۔

اورینٹل کالج لاہور میں پندرہ بیس برس تک علوم مشرقی کے پروفیسر رہے اور صد ہا شاگردوں نے آپ سے فیض پایا۔ پروفیسر آزاد کے ہم عصر تھے۔ سنا ہے کہ خود مولانا مرحوم حضرت صہبائی کے نامور تلمیذ تھے۔ چند شعر بڑی کوشش سے ہاتھ آئے جو بطور یادگار درج تذکرہ کئے گئے۔ مولانا شبلی کو بھی مرحوم سے تلمذ تھا۔

اس جفا پر بھی کی وفا ہم نے
کیا کیا تم نے کیا کیا ہم نے

کرتے ہیں سہہ رہے صدمات فراق
خوب سوجھی ہے یہ دوا ہم نے

چھیڑ کر ان کو بزم دشمن میں
جو نہ سننا تھا وہ سنا ہم نے

کہتے ہیں جور بھی غنیمت ہے
جب کیا شکوہ جفا ہم نے

رونے میں نہ تھا جو تری آنکھوں کا تصور
آئے گل نرگس مرے دامن میں کہاں سے

کس نے لیا اس چاند سے رخسار کا بوسہ
یہ داغ لگا یار رخ روشن میں کہاں سے

اڑتی تھی ابھی خاک گلستاں میں خدایا
اک بار یہ پھول اگے گلشن میں کہاں سے[2]

اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اچھی شاعری کی ہے، نواب صدیق حسن خاں (م ۱۸۸۹ء) نے "شمع انجمن" میں منتخب شعری نمونے درج کیے ہیں ویسے فارسی کلام کا مجموعہ "نسیم فیض" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فارسی کے کچھ شعر دیکھیے:

زاہد بریں مناز کہ دنیا گذاشتم　　　ایں ہمت من سن کہ عقبیٰ گذاشتم
چوں پای خود بدامن راحت نمی کشتم　　　آسودگی بنقش کف پا گذاشتم

شرم آمدم کہ شکوہ درد جگر کنم — دست طبیب و پای مسیحا گذاشتم
این است فیض صحبت پیر مغاں کہ باز — زہد و صلاح و توبہ و تقویٰ گذاشتم ۳

ان دونوں زبانوں میں انہوں نے تفنن طبع کی خاطر شاعری کی ہے اور بنیادی طور پر عربی شعر و ادب سے ہی حقیقی شغف رہا ہے۔ ہندوستان میں عربی کے چند جو اہم صاحب دیوان شعراء گزرے ہیں ان میں ایک اہم نام فیض الحسن کا بھی ہے ان کا عربی دیوان "دیوان الفیض" حیدرآباد سے شائع ہوا ہے جس میں ایک ہزار پانچ سو انچاس (۱۵۴۹) اشعار ہیں۔

عربی کے مختلف اصناف سخن میں انہوں نے شعر کہے ہیں۔ ان کے دیوان میں مدح، مرثیہ اور غزل کے بہترین عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اپنے بزرگوں اور محسنوں کے مدحیہ قصیدے لکھے ہیں۔ ان خوش نصیب بزرگوں میں نواب کلب علی خاں (م ۱۳۰۴ھ) نواب محمد صدیق خاں علوی (م ۱۸۸۹ء) بھی شامل ہیں۔

نواب کلب علی خاں کی مدح میں کہے گئے چند شعر دیکھئے:

سمعت صباح الیوم مونس الکری — فهاج من التغرید مالم اکن ادری
فقمت علی فوری و غردت مطربا — بکلب علیخان الکریم علی قدری
فتی جده فوق الجد ود وجده — یعد مجدا فهو عین العُلی البدر
ید ود له مرفوعة وهو لا یری — جفان له مرضوعة وهو لا یدری
ابوالفیض یقری کل من ضافه بان — یحکمه فی المرق واللحم والقدر ۴

ان کے علاوہ دوسری ہستی نواب محمد صدیق خاں کی ہے جن کی علمی اور ادبی حیثیت سے مولانا بہت متاثر تھے۔ ان کی شان میں کہے گئے یہ شعر:

آآل علی ابشروا ثم ابشروا — بان فتی منکم کریم و خیبر
جواد کریم ارسلت قبل عارض — سری فغدا ید نومن الارض یمطر
کریم له عز و فضل وسودد — وعرق به یعلو و مجد و مفخر
له ذکر خیر فی النوادی وخیره — کثیر و لا ینفک یمنو و یکثر
تری کل صندید سوار و حوله — قیان ویجریه مغن و مزهر ۵

اس کی واضح مثال ہیں:

مولانا نے مرثیے بھی بہت سے لوگوں کے کہے ہیں۔ جن میں کچھ بزرگ، کچھ اپنے دوست اور عزیز بھی شامل ہیں۔ بزرگوں میں فضل حق خیرآبادی اور احمد علی سہارنپوری (م ۱۲۹۷ھ) دوستوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) مولوی احمد حسن مرادآبادی (م ۱۳۳۰ھ) اور مولوی سلطان حسن اور عزیزوں میں اپنے چھوٹے بیٹے کی وفات پر مرثیے کہے ہیں۔

فضل حق خیرآبادی کی وفات حسرت آیات پر بہت ہی دردانگیز اور پرسوز مرثیہ لکھا ہے اور ان کی علمی اور شخصی عظمت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے:

لقد مات مولانا الذی لا یماثله　　اغر کریم النفس جم فواضله

فواضله جم و غر کانھا　　نجوم علی ان تزنهن فضائله

لقد کان ذا فضل وعلم وحکمة　　له حجج عز و منها رسائله

لقد کان فیمن کان راسا وهامة　　وما ذاك قولا باطلا انا قائله

لقد کان نحریرا جلیلا و مقتنا　　لما دق من علم خفی مسائله

لقد کان بحرا لو جمعنا صفاته　　لکان کتابا ثم کنا ندواله

مولانا احمد علی سہارنپوری جیسے عظیم محدث کی وفات پر مندرجہ ذیل دردناک شعر کہے ہیں:

دهانی بغتة امر مریم　　فهام به فواد لا یهیم

فلما ان تحقق ان توفی　　الهمام همامه احتاج الاحیم

ایا من کان یجدی الناس نفعا　　درجت ولم یفر بلك الدروج

اپنے رفیق خاص قاسم نانوتوی کی وفات سے انہیں جو گہرا صدمہ پہونچا اس کا اظہار ان شعروں سے ہوتا ہے:

نعی ناعیا حبس الکریم فاسمعا　　نعیا یدق المتل همته فصدعا

جزاد اجلیل الور متته بجندل　　یدا حارث لم تلفه متقدما

سمعنا فغدنا اذ سمعنا نعیه　　کمثل رماح لا تراهن مشرما

سمعت ولم اسمع نداء او لا صدی   وهل یسمعن من کان مثلی مفجعا
وکان معی دهرا نفرق بینها   فصرنا کانا لم نبت لیلة معا
سقیا سقانی القول والفعل صادقا   اعز کریم النفس ندیا سمیدعا

مدح و مرثیہ کے علاوہ مولانا نے شب و روز کی کہانی اور زندگی کے اہم ترین واقعات کی طرف اشارے کئے ہیں۔ دل پہ جو بھی گزری ہے اسے رقم کیا ہے۔ بچپن کے کوائف اور جوانی کے دنوں کی یادوں کو کس خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے:

کان الهدی... وکنت صبیا بالغا   وشربته عذبا فراتا سائغا
عهدی به مصری مربعا ممرعا   ورعیته روضا خصبا ... فصنا
الم تر ان المال غاد و رائح   وان الغنی مما تطیح الطوائح
ان الفتی من بعد ما فاته الغنی   لیعود کغصن حقیقته البوارح
ولکن اصابتنی مرارا کثیرا   مصائب حتی استاصلنی الجوائح[9]

مولانا نے ایک شہر کی ہجو بھی کی ہے جہاں وہ بہت دنوں تک مقیم رہے تھے۔ درج ذیل شعروں سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

لقد حللت علی بالی وبلبالی   ببلدة ما بها عمی ولا خالی
ببلدة لا تری فیها فتی کملت   جیرانه وجلیسا ناعم البال
ببلدة قد خلت عن کل مکرمة   وهل سمعتم بمصر فارغ خال
ببلدة ما بها جهد و ماثرة   وما بها کریم النفس مفضال
اکبرهم الدنیا و مبلغهم   من الوسائل ما کانت الی المال
ما کنت فیهم بمقدور ولا قذر   ولا لدیهم بمقلی ولا قال
لو کنت فظا غلیظا جافیا جلفا   لکنت فیهم طرید امن الحال
وما لکان هذی الارض قاسیة   قلوبهم کجلا مید الاجبال
لانت صخور وما لانت قلوبهم   فلم یزل وزلت هم ادعال لہ

مولانا کی عربی شاعری کے بارے میں کوئی رائے دینے سے پہلے ہندوستان میں عربی شاعری

کا ایک عمومی جائزہ لینا زیادہ بہتر ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء) کی یہ رائے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ:

"مسعود بن سعد بن سلمان لاہوری، قاضی عبدالمقتدر شریحی، احمد تھانیسری، میر عبدالجلیل بلگرامی، سید طفیل محمد بلگرامی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، آزاد بلگرامی، فضل حق خیرآبادی اور فیض الحسن سہارنپوری جیسے فضلاء عربیت کے اساطین کہے جاسکتے ہیں حالانکہ ان کی تربیت و پرداخت عربیت کی فضا سے مختلف ماحول میں ہوئی اور ان کا وطن سرزمین عرب سے بہت دور ہے۔ کوئی بھی نقادان کے عربی کلام پر نقد و تبصرہ کر کے کچھ خامیاں ظاہر کرسکتا ہے جس کا ہمیں مطلق افسوس نہیں کیونکہ ہندوستان میں مختلف قوموں کے ربط و ضبط اور عربی ماحول سے بیگانگی وغیرہ ایسے صریح اسباب و علل ہیں جن کے پیش نظر یہ نتیجہ آسانی کے ساتھ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں عربی زبان کو بلند مقام اور ادبی فنون کو خاطر خواہ فروغ حاصل نہیں ہوا اس لیے ان حالات میں عربی شاعری کی حیثیت کا بلند نہ ہونا، کلام کا صنائع و بدائع سے ایک حد تک خالی ہونا اور اہل ہند کی عربی شاعری کا منظوم، موزوں اور مقفی ہونا خصوصیت ہے، اور بس"۔ ؎

اسی سے ملتی جلتی رائے ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی بھی ہے: "اس میں شک نہیں ہے کہ فطری شاعر جس خوبی سلاست اور روانی کے ساتھ اپنی مادری زبان میں شعر کہہ سکتا ہے اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ ایک اجنبی اور خاص کر عربی جیسی قدیم زبان میں اس طرح شعر کہے جس طرح اہل زبان کہتے ہیں، درست نہ ہوگا۔ شاعر جس ماحول میں پلتا ہے اور جس زبان کے الفاظ سے اس کے کان عہد طفولیت سے آشنا ہوتے ہیں ان میں جذبات و خیالات کا اظہار ایک طبعی امر ہے ایک اجنبی زبان میں جس کا ماحول، بندش اور ترکیب مختلف ہوتی ہے انہی خیالات و جذبات کا ظاہر کرنا اکتسابی اور مشکل ہے اس پر بھی ہندوستان کے شعراء نے جو قادرالکلامی دکھائی ہے وہ اہل زبان سے بھی خراج تحسین حاصل کرچکی ہے۔" ؎۱۲

یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر کا معاملہ نثر سے بہت مختلف ہے۔ عربی کے نثری ادب کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان میں سید مرتضیٰ بلگرامی (م ۱۷۹۱ء) مصنف تاج العروس شرح قاموس رضی الدین حسن صغانی (م ۱۲۵۲ء) مصنف "العباب الزاخر"، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی صاحب "کشاف

اصطلاحات الفنون" جیسے جید علماء اور ادبا مل جائیں گے جن کی تحریریں عرب نژاد ادبا کے لئے بھی مشعل راہ ہیں۔ مگر "شعر چیزے دیگر است" اس لئے یہاں کے عربی کلام میں حد درجہ عجمی اثرات پائے جاتے ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر زبیر احمد: "یہاں کے بہترین شعراء بھی صرف عمدہ فن کار تھے جو حسین الفاظ سے کھیلنے کے سوا کچھ اور نہ کر سکے۔"[۲۳]

ویسے ہندوستان میں عربی کے بہترین شاعروں میں مسعود بن سعد سلمان، امیر خسرو، نصیر الدین چراغ دہلوی، قاضی عبد المقتدر شریحی، احمد تھانیسری، شاہ احمد شریفی، محمد بن عبد العزیز مالاباری سید علی خاں ابن معصوم، سید عبد الجلیل بلگرامی اور علامہ آزاد بلگرامی صاحب مرآۃ الجمال کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ مولانا کی شاعری کے مطالعہ کے بعد مجموعی طور پر یہ تاثر ذہن میں ابھرتا ہے کہ ان کی شاعری ہند نژاد عربی شعراء میں ایک خاص مقام رکھتی ہے اور محدود اصناف سخن میں طبع آزمائی کے باوجود ان کا شعری کردار بہت بلند نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے متنبی اور دیوان حماسہ کو ایک زمانے تک مطالعہ میں رکھا ہے اور تعلیم بھی دی ہے اس لئے عرب شاعروں کے افکار و خیالات، محاسن کلام سے وہ بہت حد تک مانوس ہو چکے تھے۔ عربی فضاء ان کے لئے اس قدر مانوس ہو گئی تھی کہ ہندوستان میں بیٹھ کر عرب دنیا کے بارے میں سوچتے ہوئے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود عرب دنیا میں موجود ہیں اور عربی کے اہم شعراء متنبی، ابو نواس، بشار بن برد بھی ان کے ساتھ ہیں۔

انہوں نے شاعری میں بھی سادہ اور سہل لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ کلاسیکی شاعری سے متاثر ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری کا رنگ بھی کلاسیکی نظر آتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کا انکی شاعری کے بارے میں یہ خیال ہے: "در نظم عربی کار نامہ شعراء عرب پیش می برد او در یں فن ید بیضاء می نماید" اس جملے میں گو کہ مبالغہ کا عنصر بھی ہے مگر اس سے ان کی عظمت ظاہر ہوتی ہے

۳- تصانیف پر ایک نظر:

مولانا نے علمی دنیا میں یادگار کے طور پر بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں جو اپنے متعلقہ

موضوعات پر خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں سے اکثر نایاب یا کم یاب ہیں۔ ان کی جملہ تصانیف میں " تحفہ صدیقیہ، عروج المفتاح، ریاض الفیض، حل ابیات بیضاوی، شرح دیوان الحماسہ، تعلیقات الجلالین گلزار فیض، ترتیب دیوان حسانؓ قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں چند دستیاب کتابوں کا اجمالی تعارف پیش ہے۔

۱۔ تحفہ صدیقیہ:

یہ کتاب مشہور حدیث "ام زرع" کی توضیح و تشریح ہے جسے مولانا نے نواب صدیق حسن خاں کی فرمائش پر تحریر کیا ہے۔ یہ ان گیارہ عورتوں کی دلچسپ اور عبرت آموز کہانی ہے جنہوں نے ایک دوسرے سے یہ قسمیں کھائی تھیں کہ اپنے شوہر سے متعلقہ خبروں کو کسی طور پر بھی نہیں چھپائیں گی۔ شارحین حدیث نے اس کی مختلف طرح سے توضیحات پیش کی ہیں۔ مولانا نے ان لوگوں سے ہٹ کر ادبی انداز سے اس کی تشریح کی ہے۔ مستند اور کلاسیکی شعراء کے شعری استشہاد، لفظی، لغوی استناد اور تجزیے کی وجہ سے اس کی بہت اہمیت ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع خورشید عالم لاہور سے ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۲۔ شرح دیوان الحماسہ المعروف بالفیضی:

ابوتمام (م ۲۳۶ھ) عباسی دور کے ممتاز شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک شعری انتخاب "دیوان الحماسہ" کے نام سے شائع کیا۔ اس انتخاب کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے اس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں جن میں ابن جنی (م ۳۹۲ھ) مرزوقی (م ۴۲۱ھ) اور خطیب تبریزی (م ۵۰۲ھ) کی شرحیں خاص طور پر تذکرے کے قابل ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس کی شرحیں ہوئیں مگر اس کے باوجود مولانا کے دل میں اس کی شرح لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کی وجہ بتلاتے ہوئے مولانا فیض نے ابتدائیہ میں لکھا ہے:

" دیوان حماسہ ایک زمانے سے مدارس اسلامیہ میں مقبول و متداول رہا ہے۔ اس کے اشعار کی توضیح و تشریح تبریزی نے کی ہے مگر طویل اور ضخیم ہونے کی وجہ سے عام طالب علموں کی دسترس سے باہر ہے اس لئے میرے دل میں دیوان کی شرح لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اس میں دیوبند اور سہارنپور

کے طلبا ر کی محنتوں کا بھی خاص دخل ہے۔ میں نے اس کتاب میں اپنی تمام تر کوششیں لفظی تشریح و توضیح، مشکلات و معضلات کی تفہیم و تسہیل، شعری مفاہیم، پس منظر کے ساتھ سوانحی اشارے پر مرکوز کر دی ہیں۔ اور ادوار کے امتیازات و تفرقات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس شرح میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جس کا تذکرہ متقدمین میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لئے تبریزی، اغانی، مقدمہ ابن خلدون، وفیات ابن خلکان، کامل، اصابہ اور اُسد الغابہ کے مصنفین اور صنادید عربی ادب کی تحریروں سے خصوصی استفادہ کیا ہے۔"[۱۴]

مولانا کی یہ شرح "الفیض" کے نام سے شائع ہوئی ہے انتہائی جامع اور مفید مطلب شرح ہے مصنف نے خود ہی اپنی انفرادیات اور وحدانیات کا ذکر کیا ہے۔ ہر شعر کی تشریح، بحر و قافیہ کا تعین شعرا کے سوانحی اشارے کیوجہ سے عام طالب علموں کے لئے ایک کام کی چیز ہے، مولانا کی یہ توضیح و تشریح تصنیف نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی ہے اور ۸۰۰ صفحات پر محیط ہے۔

۳۔ حل ابیات بیضاوی:

عبداللہ بن عمر ناصر الدین (م ۶۸۵ھ) نے ایک تفسیر "انوار التنزیل و اسرار التاویل" کے نام سے لکھی ہے جو مدارس اسلامیہ کے نصاب میں متداول ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں منظر عام پر آگئی ہیں ہندوستان میں اس پر سب سے مقبول حاشیہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۷ھ) کا مانا جاتا ہے مولانا نے بھی طالب علموں کی خاطر اس کی ایک شرح لکھی ہے جس میں کلام پاک کے معانی کی تشریح میں پیش کئے گئے کلام شعرا ر عرب کی وضاحت کی ہے۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دہلی سے ۱۲۰۰ء میں شائع ہوئی ہے۔

۴۔ تعلیقات الجلالین:

جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے جو ایک کثیر التصانیف بزرگ ہیں جلال الدین محلی کے اشتراک سے ایک تفسیر لکھی جو "جلالین" کے نام سے مدارس عربیہ میں مشہور ہے۔ اس کی بہت ساری عربی اور اردو شروحات لکھی گئی ہیں۔ ہندوستان میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد

میں سے سلام اللہ (م ۱۸۱۳ء) نے "الکمالین" کے نام سے حاشیہ لکھا ہے اور علامہ تراب علی نے "الہلالین" کے نام سے۔ مولانا نے بھی اس کے مشکل الفاظ و تراکیب کو حل کرنے کے لیے ایک شرح لکھی جو ۱۸۷۰ء میں علی گڑھ سے چھپی۔

ان کے علاوہ سبع معلقہ کی ایک شرح ریاض الفیض ہے جو لاہور میں ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ ان کی ایک تصنیف ضوء المشکوٰۃ ہے جس کا قلمی نسخہ ٹونک میں محفوظ ہے۔ انھوں نے حضرت حسان بن ثابت کے دیوان پر حواشی بھی لکھے ہیں جو متن کے ساتھ لاہور سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔

۴۔ علمی اور ادبی مرتبہ :

مولانا کے علمی اور ادبی مرتبے کا تعین ان کے فنی شہ پاروں کے علاوہ ان جوہر قابل اور یگانہ روزگار تلامذہ سے کیا جا سکتا ہے جن میں سر سید احمد خاں (م ۱۸۹۸ء) علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) خواجہ الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) وحید الدین سلیم پانی پتی (م ۱۹۲۸ء) عبد الحمید فراہی (۱۸۶۲ء۔ ۱۹۳۰ء) مفتی عبد اللہ ٹونکی (م ۱۹۲۴ء) خلیل احمد سہارن پوری (م ۱۳۴۶ھ) نذیر احمد سہسوانی (م ۱۳۰۹ھ) مولانا اسماعیل علی گڑھی (۱۲۶۳ھ) مشتاق احمد انبیٹھوی (۱۲۷۲ھ۔ ۱۳۶۰ھ) محمد عرفان بریلوی (۱۲۶۵ھ) عبد العلی میرٹھی (م ۱۳۴۰ھ) عبد الرحمٰن سہارن پوری (م ۱۳۴۶ھ) اصغر علی روحی (۱۸۶۷ء) عبد الجبار عمر پوری (۱۲۷۷ھ) ظفر الدین لاہوری (۱۲۷۵ھ) احمد الدین لاہوری محمد بن احمد ٹونکی (۱۲۷۳ھ) امیر باز خاں سہارن پوری جیسے اہم اور معتبر نام شامل ہیں۔ ان کی بلند مرتبت اور علمی عظمت کا اعتراف مشاہیر نے کیا ہے۔ متاخرین علماء نے بھی ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی کا ان کی بلند شخصیت کے بارے میں یہ خیال ہے کہ :

"مولانا فیض الحسن اس زمانے کے اصمعی اور ابو تمام سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے پورے اسلامی دور میں قاضی عبد المقتدر کے سوا یہی ایک فرد تھا جو عربی شاعری کا صحیح مذاق رکھتا تھا ان کی شرح حماسہ اور دیگر ادبی تصنیفات اس کی شاہد عدل ہیں اور اب ان کا عربی دیوان بھی چھپ گیا ہے جو اہل زبان کی ٹکر کا ہے۔" [۵۱]

ایک جگہ اور شبلی نعمانی کے ذیل میں سید سلیمان ندوی نے ان کی عظمت کا اعتراف یوں کیا ہے :

"مولانا فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر اورینٹل کالج لاہور اس پایہ کے ادیب تھے کہ

خاک ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔ مولانا فیض الحسن صاحب کا بڑا فیض یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے عربی ادب میں انقلاب برپا کر دیا اور متاخرین سے ہٹا کر طلبہ کو قدیم شعرائے عرب کی طرف متوجہ کیا۔"[16]

مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول: "مولانا فیض الحسن مرحوم اس وقت اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے اور عربی ادب میں پورے ملک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ادب میں مولانا شبلی بھی ان ہی کے شاگرد تھے۔"[17]

مولانا کی علمی شہرت کی وجہ سے دور دراز سے طلبا اکتساب و استفادے کی خاطر آیا کرتے تھے اور اس وقت انساب و ایام عرب کے سلسلے میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ پنجاب میں مولانا کی وجہ سے علم و ادب کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ مولوی عبداللہ قریشی کے خیال میں: "ان کے دم قدم سے پنجاب میں اردو کا باغ لہلہا رہا تھا ان کی موجودگی سے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں بڑی رونق ہوتی تھی اور وہ اپنے لائق شاگردوں کے ساتھ اس کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دیتے تھے۔"[18]

علامہ شبلی نعمانی نے ان کی وفات کے بعد خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کا ایک ایک لفظ محبت، عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے اور ایک ایک حرف ان کی علمی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ چند شعر اس مرثیے کے بھی دیکھئے:

دریں آشوب غم عذرم بند گر نالہ زن گریم	جہانے را جگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم
بہ تحسیں صبوری چند بفریبی مرا ناصح	دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم
بمرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد	ہنر بر خویشتن گرید چو من بی خویشتن گریم
نگویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید	عرب را زندہ کردن وانگہ از ہندوستان بودن
سخن را ایں چنیں شیرازہ بستن تا کہ بتواند	پس از دی دفتر معنی پریشان گشت وابتر ہم
بہ اوج پایہ اش من خود ندیدم در جہاں کس را	ولیس پس مثل او ہرگز نہ بیند چشم اختر ہم"[19]

ان کے علاوہ مولانا حمید الدین فراہی نے بھی مولانا کی شان میں ایک طویل عربی قصیدہ لکھا ہے۔ اور اپنے استاد کی عظمت، رفعت اور بلندی سے بھرپور عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مولانا ایک جلیل القدر عالم، ادیب لبیب اور عظیم فن کار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ اور ان کی انہی نمایاں علمی خدمات کی وجہ سے مولوی سعید اقبال قریشی نے لاہور یونیورسٹی سے ان کے فن و شخصیت کے مختلف